افتتاحی تقریر سید علی امام

۱۹۰۸

آل انڈیا مسلم لیگ

افتتاحی تقریر مولوی سید علی امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا رئیس بانکی پور
صدر نشین اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ، بمقام امرتسر۔ بتاریخ ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء

بزرگان قوم! میں اس بڑے اعزاز کیلئے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپنے "آل انڈیا مسلم لیگ" کے اس جلسہ کا صدر نشین بناکر مجھکو عطا فرمایا ہے۔ اور یہ پہلا جلسہ ہے جو مارچ گذشتہ میں لیگ کے قواعد و ضوابط منظور ہونے کے بعد منعقد ہوا ہے۔ یہ منصب جو آپنے مجھکو عطا فرمایا ہے در حقیقت ایک لائق افتخار منصب ہے اور گو کہ میں اس منصب کیلئے کیسا ہی ناقابل ہوں، تاہم میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ یہ موقع میری زندگی میں سب سے زیادہ لائق فخر و ناز ہے۔ مسلمانوں کے متعلق پولیٹکل مسایل نہایت اہم ہیں، اس لئے میں اس بات پر نہایت افسوس کرتا ہوں کہ بعض ناگزیر وجوہ سے یہ جلسہ مولوی سید امیر علی صاحب سی۔ آئی۔ ای کی صدارت سے، جو غیر معمولی قابلیت کے لیڈر ہیں، محروم رہ گیا ہے۔ انکا فضل و کمال، ان کی پختہ رائیں اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی پرجوش محبت انکو ہندوستانی مسلمانوں میں ایک اعلیٰ لیڈر بناتی ہے اور ان کو اس امر کا حق عطا کرتی ہے کہ وہ ہماری قوم کی پولیٹکل قوتوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ افسوس ہے کہ اس موقع پر اس نامور فاضل اور اس کے پر فکر دماغ کی رہنمائی ہم کو حاصل نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ لازمی بات ہے کہ میں اس ذمہ داری کے بوجھ کو اچھی طرح محسوس کروں جو قوم نے اسوقت میرے کندھوں پر رکھا ہے۔ پولیٹکل معاملات پر بحث کرنے کیلئے ضروری ہے کہ خیالات صاف اور روشن ہوں، بحث کرنے والوں میں دور اندیشی ہو، ان کے طریقہ بحث میں اعتدال ہو، ان کی گفتگو جذبات کو نہ بھڑکائے، خیالات کا اظہار واضح طور سے کیا جائے، ان کے دماغ میں دانائی ہو، ان کے اندر قوت فیصلہ ہو، وہ مخالفوں کی رایوں پر تحمل سے غور کرتے ہوں اور واقعات گرد و پیش کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں۔ میں اس خیال سے کہ مجھ میں ہر قسم کی کمی ہے، مغلوب ہو گیا ہوں، مگر اس کے ساتھ مجھے یقین ہے کہ یہ مجمع، جس کے صدر نشین ہونے کا فخر مجھکو حاصل ہے، اس قوم کی اصلی خواہشوں اور رایوں کا نمایندہ ہے، جو باوجود کمی تعداد کے اپنی نسل کی خوبیوں اور اپنی پولیٹکل اور انتظامی لیاقتوں کی روایتوں سے مالا مال ہے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس کام میں جو آپ کے پیش نظر ہے یعنی آپ کی قوم کا پولیٹکل نشو و نما، آپ تحمل اور دانائی سے کام لیں گے اور یہی دونوں خوبیاں کامیابی کی نقیب ہیں۔ پولیٹکل لحاظ سے

ہندوستان کے مسلمان ایک بے مثل درجہ رکھتے ہیں اور میں یقین کرتا ہوں کہ دنیا کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ہے۔ ایک ہزار برس کا عرصہ گذرا کہ عرب مسلمان نے سندھ کے ریگزاروں کی خوشبو سونگھی اور اس کے ریتہ کے ٹیلوں اور کھجور کے درختوں نے ان کو ملک حجاز کی یاد دلائی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی فتوحات کی لہریں ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئیں۔ شاہی خاندانوں کی قطاریں مدت تک بلند ہوتی اور گرتی رہیں، مگر مسلمانوں کی حکومت کا سلسلہ بغیر اس کے کہ درمیان سے ٹوٹے، جاری رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کی حاکمانہ برتری مرہٹوں کے برچھوں اور انگریزوں کی سنگینوں کے درمیان لٹکنے لگی۔ اسلام کو ہندوستان میں اس کشمکش کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں ہندوؤں کی جنگی طاقت نہیں بلکہ ان کی مذہبی طاقت شریک تھی۔ جو کام ہندوؤں کے بچانے میں انکی جنگی طاقت نہ کرسکی وہ ان کے مذہب، فلسفہ اور تمدنی خیالات کے ہاتھ سے انجام ہوا۔ صدیاں گذر گئیں مگر فاتح اور مفتوح، دونوں اپنی قومیت، طرز معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے۔ نسلی اور مذہبی خصوصیات اور پولیٹکل اور سوشل خیالات دونوں قوموں کے جدا جدا رہے۔ قران مجید دوسری قوموں کو مذہب اسلام کے دایرے میں داخل کرنے اور ان کو یکساں پولیٹکل اور سوشل حقوق دینے پر نہایت فیاضی سے آمادہ ہے۔ اسلام کی برادری میں داخل ہونا لوگوں کیلئے بلند سے بلند درجے تک پہونچنے کیلئے ایک پاسپورٹ ہے۔ اسلام ایک وسیع مذہب ہے اور اس میں اس بات کی قابلیت ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو بخندہ پیشانی بغل گیر کرے۔ برخلاف اس کے ہندو مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگ اپنے مذہب پر سختی کے ساتھ جمے رہیں۔ اس نے اپنے دایرہ میں غیر مذہب والوں کو داخل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے اپنے تئیں ذات کی قیدوں میں محدود کر دیا۔ ہندو اسی وقت ہندو ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہندو گھر میں پیدا ہوا ہو۔ مگر اسلام میں یہ پابندی مطلق نہیں ہے۔ دونوں قوموں کے مذہبی خیالات مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی خالص وحدانیت کا خیال ہندوؤں کی خوبصورت دیومالا کے بالکل برخلاف ہے۔ مشرق میں مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ مذہب ہی سوسائٹی کی عمارت کو تیار کرتا ہے اور وہ ہی لوگوں کی زندگی کے تمام کاموں کا منبع ہے۔ مغرب میں یہ حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سوشل تعلقات ابتک ایسے ہیں کہ وہ

ہندوستان کے مسلمان ایک بے مثل درجہ رکھتے ہیں اور میں یقین کرتا ہوں کہ دنیا کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ہے۔ ایک ہزار برس کا عرصہ گذرا کہ عرب مسلمان نے سندھ کے ریگزاروں کی خوشبو سونگھی اور اس کے ریت کے ٹیلوں اور کھجور کے درختوں نے ان کو ملک حجاز کی یاد دلائی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی فتوحات کی لہریں ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئیں۔ شاہی خاندانوں کی قطاریں مدت تک بلند ہوتی اور گرتی رہیں، مگر مسلمانوں کی حکومت کا سلسلہ بغیر اس کے کہ درمیان سے ٹوٹے، جاری رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کی حاکمانہ برتری مرہٹوں کے برچھوں اور انگریزوں کی سنگینوں کے درمیان لٹکنے لگی۔ اسلام کو ہندوستان میں اس کشمکش کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں ہندوؤں کی جنگی طاقت نہیں بلکہ ان کی مذہبی طاقت شریک تھی۔ جو کام ہندوؤں کے بچانے میں انکی جنگی طاقت نہ کرسکی وہ ان کے مذہب، فلسفہ اور تمدنی خیالات کے ہاتھ سے انجام ہوا۔ صدیاں گذر گئیں مگر فاتح اور مفتوح، دونوں اپنی قومیت، طرز معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے۔ نسلی اور مذہبی خصوصیات اور پولیٹیکل اور سوشل خیالات دونوں قوموں کے جدا جدا رہے۔ قرآن مجید دوسری قوموں کو مذہب اسلام کے دائرے میں داخل کرنے اور ان کو یکساں پولیٹیکل اور سوشل حقوق دینے پر نہایت فیاضی سے آمادہ ہے۔ اسلام کی برادری میں داخل ہونا لوگوں کیلئے بلند سے بلند درجے تک پہونچنے کیلئے ایک پاسپورٹ ہے۔ اسلام ایک وسیع مذہب ہے اور اس میں اس بات کی قابلیت ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو کشادہ پیشانی بغل گیر کرے۔ برخلاف اسکے ہندو مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگ اپنے مذہب پر سختی کے ساتھ جمے رہیں۔ اس نے اپنے دائرہ میں غیر مذہب والوں کو داخل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے اپنے تئیں ذات کی قیدوں میں محدود کر دیا۔ ہندو اسی وقت ہندو ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہندو گھر میں پیدا ہوا ہو۔ مگر اسلام میں یہ پابندی مطلق نہیں ہے۔ دونوں قوموں کے مذہبی خیالات مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی خالص وحدانیت کا خیال ہندوؤں کی خوبصورت دیو مالا کے بالکل برخلاف ہے۔ مشرق میں مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ مذہب ہی سوسائٹی کی عمارت کو تیار کرتا ہے اور وہ ہی لوگوں کی زندگی کے تمام کاموں کا منبع ہے۔ مغرب میں یہ حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سوشل تعلقات اب تک ایسے ہیں کہ وہ

ایک دستر خوان پر کھا نہیں سکتے اور آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ دونوں قومیں اپنے
تمدنی حالات کے لحاظ سے اب بھی ایک دوسرے سے اسی قدر دور ہیں جس قدر کہ وہ ہزار برس
پہلے تھے۔ زمانہ کی گردشوں نے ان کے تمدنی نظامات کو نہیں بدلا اور ان کے بعض پولیٹیکل
اصول بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں قومیں بادشاہی کے متعلق جدا جدا خیالات
رکھتی ہیں۔ مسلمان بادشاہ وہ ہے جو اپنی مجلس کا صدرنشین ہو اور نماز میں مسلمانوں کا امام
اور میدان جنگ میں انکا سپہ سالار ہو۔ وہ ملک اور مذہب کا یکساں پیشوا ہے۔ ہندو بادشاہ
پر مذہبی طور سے یہ فرض ہے کہ وہ برہمن کے پاؤں کے انگوٹھے کو بوسہ دے۔ پوپ کے فرمان
یورپ کے بادشاہوں کیلئے ایسے خطرناک ثابت نہیں ہوئے جیسے کہ ایک برہمن کی پیشانی کے
بل ہندو فرمانرواؤں کیلئے خوفناک ہیں۔ یہ بات نہایت واضح اور روشن ہے کہ نسلوں کا اعتبار
چھوڑ کر دونوں قوموں کے یقین اور اعتقاد میں کوئی مخفی بات ضرور ایسی ہے جو لازوال ہے اور اسی
سبب سے دونوں قومیں اپنے اپنے یقین اور اعتقاد کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ بعض باتیں ہندوؤں میں
قابل تعریف ہیں۔ انکا مذہب ناقابل تسخیر ہے۔ وہ اپنی ذات میں کامل ہے۔ اسکی بنیاد خیالات
اور جذبات کی اندرونی چٹانوں پر ہے۔ وہ ایک عظیم الشان ~~ہستی~~ مرتب نظام ہے اور وہ
باوجود بیرونی حکومتوں کے اثر کے مدتوں تک اپنے حال پر قائم رہا ہے۔ مسلمانوں کے مذہب کے
طاقتور اور مضبوط اصولوں نے فاتح مسلمان کیلئے اس بات کو ناممکن کر دیا کہ وہ اپنے وجود کو اس
ملک کے تمدن میں جذب ہونے دیں۔ عالی شان پیغمبر اسلام کی اس تعلیم نے جو روحوں کو بلندی پر
لے جاتی ہے، نوع انسان کو ایک معقول اور زندہ اعتقاد عطا کیا ہے۔ اس صور کی آواز نے جو مسلمانوں کو
میدان نیکی و فرض کی طرف دوڑنے کیلئے بلند کی گئی تھی۔ اسلام میں نہ ختم ہونے والی گونجیں پیدا کر دی
ہیں۔ ان حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت ایک دوسرے کی قومیت میں جذب ہونے کی پیشین
گوئی کرنی ناممکن ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت حاصل کی، تو انہوں نے
اسکے جسم کو دبائے رکھا، مگر وہ اس کی روح کو مغلوب نہ کر سکے۔ پولیٹیکل امور کے لحاظ سے دونوں قوموں کے
تعلقات ایسے تھے کہ وہ ایک نقطہ پر نہیں مل سکتے تھے۔ اکبر اعظم کی عقل دور اندیش نے اس حالت کو
دیکھا۔ اس نے چاہا کہ دلجوئیوں اور مذہبی رعایتوں کے عطا کرنے سے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے پولیٹیکل

اور سوشل میلانوں کو ایک سمت میں لے آئے، مگر اسکی پنجاہ سالہ فیاض حکومت نے ثابت کردیا
کہ یہ تجربہ قطعاً ناکام رہا اور آپس کے اختلافات جذب نہ ہو سکے۔ اس مصلح فرمانروا نے ہندوؤں کی
دوستی حاصل کی، مگر اس دوستی کی بنیاد ہندوؤں کے اس خیال پر تھی کہ اکبر کی حکومت عادل اور
فیاض ہے۔ وہ اس بات پر مبنی نہ تھی کہ ہندوؤں نے مذہب اسلام کو اور اسکے سوشل اور پولیٹیکل
اصولوں کو قبول کرلیا تھا۔ دونوں قوموں کے مذہبی، تمدنی، تاریخی اور سیاسی اختلافات مناسب
موقع پر نکل پڑنے اور پھوٹ پڑنے پر ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں اور
مسلمانوں کے اتحاد کی پولیٹیکل ضرورت اپنے دادا کیطرح محسوس نہیں کی، مگر اس نے بالجبر مسلمان بنانے
کا خطرناک طریقہ اختیار کیا جو رواداری اور فیاضی کے بالکل برخلاف تھا۔ یہ تجربہ بھی بالکل ناکام
رہا۔ مصیبتوں اور سازشوں نے دونوں قوموں کو باہم ملنے کی اجازت نہیں دی۔ دلجوئی اور زبردستی
دونوں ناکام رہیں۔ مسلمانوں کی انتظامی قوت جوں ہی کمزور ہونی شروع ہوئی، انکا کوئی یار اور
مددگار نہ رہا۔ نئی نئی ہندو طاقتیں لڑکھڑاتے ہوئے مغل تخت کے گرد بلند ہوئیں۔ یہ لڑائی
ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان خیالات کا عکس تھی، جو آپس میں مل نہیں سکتے تھے۔ عین اسوقت جبکہ
ملک زخمی تھا اور اس کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا اور جبکہ فرقی جذبات اور تعصبات دیوؤں کی
طرح اپنے تاریک غاروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور جبکہ اسلام ہندوستان میں تباہ ہونے کے
قریب تھا، قدرت نے ایک نئی طاقت کو ملک کے اندر داخل ہونیکا حکم دیا۔ جس نے اہل ملک کو
امن و امان اور تمدنی اور مذہبی آزادی عطا کی اور لاحکومتی طاقتوں اور بدامنی کے میلانوں
کو پامال کردیا۔ اور ایک ایسی حکومت اس سرزمین پر قایم کی جس نے مذہبی دیوانگی کے ہاتھ کو مفلوج
اور معطل کردیا۔ انگریزوں کا اس ملک میں داخل ہونا ہندو مذہب اور اسلام کیلئے ایک سگنل تھا کہ
وہ اپنی اپنی حدود میں پیچھے ہٹ جائیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کو ایک مضبوط اور مرتب شکل کا انتظام
عطا کیا، جو مختلف قوموں کے رسم و رواج اور مذہبی عقاید اور قومی خصوصیات کا ادب کرتا ہے تاوقتیکہ
وہ ملک کے امن و امان میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس بات کا انکار کرنا فضول ہے کہ انگریزوں کی سلطنت کا
ایک ظہور ہندوستان میں یہ بھی ہوا کہ ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کے پرجوش غصے اور خطرناک انتقام سے
بچ گئے۔ یہ وہ مبارک زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی قسمت کے افق پر سپیدہ سحری نمایاں ہوا اور ایک

ایسی دلکش اور دلفریب صبح نمودار ہوئی، جو امیدوں اور امنگوں اور ترقی و خوشحالی کی
مسرتوں سے بھرپور تھی۔ اس فیاض مغربی حکومت نے، جو اہل ملک کی رایوں کا ادب کرتی ہے
اور جس نے فیاضانہ تعلیم جاری کی ہے، گذشتہ پچاس سال میں اہل ملک کے ملکی ولولوں اور سیاسی
قابلیتوں کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اس سے پہلے یہ ترقی خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔
اخباروں اور جلسوں کی آزادی نے سلف گورنمنٹ، ہوم رول، آٹونومی اور سوراج کے غیر محدود
اور مبہم خیالات باشندگان ملک کے دلوں میں بھڑکا دئے ہیں اور اس نے بہت سے ایسے پولیٹیکل
معمے ملک کے سامنے پیش کئے ہیں، جنکی وجہ سے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب
تک ایک عام شورش اور بے چینی پھیل گئی ہے اور اس نے "ہندوستان دوستوں" کو خواہ وہ
حاکم ہوں، یا محکوم، یکساں پریشان کر رکھا ہے۔ یہ انگریزوں ہی کی فیاضی ہے، جس نے انگریزی تعلیم کے
ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں جمہوری اور دستوری خیالات کو موجزن کر دیا ہے اور اسی نے لوگوں کے
کانوں میں یہ آواز پھونک دی ہے کہ جمہور کے حقوق تمام حقوق سے بالاتر ہیں، اور اسی نے اس
خواہش کا ظاہر کرنا بتایا ہے کہ ملکی حکومت میں ان کو اعلی جگہ دی جائے۔

ملک کی تین تعلیم یافتہ نسلوں نے انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے مل، ملٹن، برک،
شریڈان اور شیلی کے خیالات ہضم کئے ہیں۔ ان کے دل انگلستان کے دستوری تاریخ کے مطالعہ سے
بھی متاثر ہوئے ہیں۔ امریکہ کی ازادی کی جنگ نے بھی ان کے دلوں پر کچھ کم اثر نہیں کیا۔ وہ اُن
تعلقات سے بھی، جو انگلستان اور اسکی نوآبادیوں کے درمیان ہیں، بیخبر نہیں رہے۔ بوئیروں کو
جو سلف گورنمنٹ حال میں دی گئی ہے جب کہ ان کے ساتھ جنگ کرنے میں بیشمار روپیہ اور
جانوں کا نقصان ہو چکا ہے، اس کے واقعات نے بھی تعلیم یافتوں میں ایک خاص جوش پیدا کیا ہے
ہندوستان کا لائق سے لائق آدمی اپنے دل کی اس موجودہ کیفیت پر اپنے تئیں قابل الزام نہیں
سمجھتا۔ یہ زمین انگریزوں ہی نے تیار کی ہے اور یہ بیج انہیں کے بوئے ہوئے ہیں جو برابر نشوونما
حاصل کر رہے ہیں۔ اور جو اب زہریلے خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ شخص جھوٹے دماغ کا ہوگا جو
ان انگریزوں کی فیاضانہ پالیسی پر ملامت کرے جنھوں نے ہندوستان میں اس پالیسی کی بنیاد
رکھی ہے، کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے لوگ اس سطح پر لائے جائیں جس پر ملکوں

اور محکوموں کے درمیان اتحاد اور اتفاق ہو سکے۔ ان حالات میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی یہ خواہش کہ ملک کے انتظام میں ان کو حصہ دیا جائے، نہ غیر فطرتی ہے نہ غیر متوقع۔ ملکہ معظمہ مرحومہ کے اعلان ۱۸۵۸ء نے ہندوستانیوں کی امنگوں اور حوصلوں کو بہت بڑھایا ہے۔ اس اعلان میں امید اور امن کا ایک چمکتا پیغام یہ بھی شامل تھا کہ "ہر شخص خواہ وہ کسی نسل کا ہو اور کوئی مذہب رکھتا ہو، سرکاری ملازمت کے ہر ایک منصب پر مقرر ہو سکے گا، جس کے فرائض کے ادا کرنے کی لیاقت وہ اپنی تعلیم اور دیانت داری کے لحاظ سے رکھتا ہو" اس اعلان کے شائع ہونے کے بعد سے ملک میں امن و امان کی برکت روزافزوں رہی ہے۔ تعلیم نے ترقی کے لمبے لمبے قدم بڑھائے ہیں۔ تجارت نے تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت اور مالی ذرائع کو بھی بہت فروغ ہوا ہے۔ حفظان صحت کا نہایت عمدہ انتظام کیا گیا ہے، بلا فیس ڈاکٹری علاج سے لوگوں کو مدد پہونچائی گئی ہے۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ جاری کئے گئے ہیں اور انہیں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ ریلوں، سڑکوں اور ڈاک اور تار کی آسانیوں نے فاصلے کو تقریباً معدوم کر دیا ہے۔ اور ان کی وجہ سے ایک صوبہ دوسرے صوبے سے متصل ہو گیا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے منصبوں میں، خواہ وہ انتظامی ہوں، خواہ قانونی، اہل ملک کو معقول حصہ دیا گیا ہے، بنگال میں لفٹننٹ گورنر کے بعد سب سے بڑے انتظامی منصب اور سب سے بڑے قانونی منصب کی کرسی ہندوستانی اشخاص کو دی گئی ہے۔ ایک فیاض وزیر ہند نے اپنی کونسل میں ہندوستانیوں کیلئے دو نشستیں مقرر کی ہیں۔ انہیں سے ایک نشست کیلئے مسلمانوں میں سے آنریبل سید حسن بلگرامی سی۔ ایس۔ آئی اس غرض سے نامزد کئے گئے ہیں کہ وہ اس عظیم الشان کونسل میں ہماری قوم کے نمائندے ہوں۔ یہ نامزدگی آنریبل ممدوح کی اس بلند شخصیت پر گواہ ہے، جو ان کو ہماری قوم میں حاصل ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔ امید ہے کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں بھی ایک ہندوستانی کو جگہ دی جائیگی۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ملک ایسے لائق اشخاص مہیا کر سکتا ہے جو لیاقت اور دیانتداری کے ساتھ وائسرائے کی اس کونسل میں اپنے فرائض کو ادا کر سکیں۔ ہماری قوم میں جب تک ضروری قابلیت کے لوگ موجود ہیں، ہم اس مجوزہ منصب پر اپنی قوم کے کسی نمائندے کو دیکھنے

سے مایوس نہیں ہو سکتے۔ مختلف صوبوں میں اعلیٰ جوڈیشنل منصبوں پر جو تقرر مسلمانوں کا حال میں کیا گیا ہے، وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گورنمنٹ ملکی انتظام میں دیگر اقوام کی طرح مسلمانوں کو بھی شریک کرنے کی دل سے خواہش مند ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم قابلیت اور دیانتداری کی خوبیاں موجود ہیں۔ اسلئے مسلمانوں کے خاص حقوق کی حفاظت کی غرض سے ان کا ملک کے اعلیٰ منصبوں پر مامور ہونا ضروری ہے۔ کافی لیاقت موجود ہونے پر مختلف قوموں کے نمایندوں کو ہندوستان کے ملکی انتظام میں داخل کرنا اس لئے اہم ہے کہ اس سے ان قوموں کا پولیٹکل موازنہ درست رہتا ہے۔ حضور ویسرای نے سڈلیشن بل پاس ہونے کے موقع پر جو تقریر کونسل میں فرمائی ہے، اس میں انہوں نے اس اصول پر زور دیا ہے۔ انکے الفاظ یہ ہیں کہ "میں اس بدگمانی کی، جو کچھ تک ہو چکی ہے، کامل طور پر تردید کرتا ہوں کہ ہندوستان کی گورنمنٹ پولیٹکل وجوہ سے ایک قوم کے حقوق کو بمقابلہ دوسری قوم کے اچھی نظر سے دیکھتی ہے۔ انگریزی حکومت کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے مختلف قوموں کے مذہبی اور قومی حقوق کا بغیر کسی تعصب کے موازنہ کیا ہے اور آیندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہیگا۔"

یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ گورنمنٹ اس ملک کے مادی وسایل کو ترقی دینے کے ساتھ اپنے اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو انتظامی ذمداریوں میں شریک کرے۔ لوکل سلف گورنمنٹ عطا کرنا، کونسلوں میں سوالات پوچھنے کا حق دینا، ہندوستانیوں کی انجمنوں کو یہ امتیاز دینا کہ وہ قانون ساز مجلسوں میں اپنے نمایندے بھیجیں، بجٹ کی تقریروں میں مفید مباحثوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس امر کی خواہش کرنا کہ ملک کے اصلی لیڈروں سے اہم معاملات میں رای لے جاے، یہ سب امور اس بات کی دلیل ہیں کہ گورنمنٹ ملکی معاملات میں عام عنصر سے کام لینا پسند کرتی ہے۔ گورنمنٹ نے ملک میں وقتاً فوقتاً ایسے طریقے داخل کئے ہیں جن سے اہل ملک کو پولیٹکل تربیت کا موقع ملا ہے۔ انگریزی حکومت کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اسکی برکت سے ملک ایک عام زبان اختیار کرتا جاتا ہے۔ انگریزی زبان اب ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تبادلہ خیالات کا عام ذریعہ ہے۔ اس نے مختلف قوموں کو کھینچ کر ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ مادی اور دماغی

اور سیاسی مفکروں نے رفتہ رفتہ وہ خیالات اس ملک میں پیدا کر دئے ہیں جن کا مجسم نمونہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ہیں۔ تمام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، ایک ہی دودھ کی بوتل سے غذا پائی ہے اور اس بوتل سے میری مراد انگریزی قوم کا عظیم الشان آزادی پیدا کرنے والا اثر ہے۔ باوجود ان تمام مذہبی اور تمدنی اختلافات کے، جو ہندوستان کی مختلف قوموں میں پائے جاتے ہیں، اس بات سے انکار کرنا فضول ہوگا کہ تمام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے ملک کی نسبت خیالات کا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ مادری ملک کی محبت کا جذبہ سب کے دل میں موجزن ہے۔ ملک کی خدمت کرنے اور اسکی مادی اور اخلاقی سرسبزی کو ترقی دینے اور اسکی عام حالت کو اصلاح پر لانے کی امنگ سب کے دلوں میں پائی جاتی ہے اور اس نے مضبوط جڑ پکڑ لی ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان بھی اپنی پیدائشی سرزمین سے ویسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اور قوموں کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ ہندوستان نہ صرف ہماری پیدائش کا مقام ہے، بلکہ ہم اس ملک کے ساتھ وراثت کے نہایت مقدس تعلقات سے جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی مادری سرزمین کی عزت کرنے اور اس سے محبت رکھنے میں ہندوستان کی کسی قوم سے کم نہیں ہیں۔ ہماری تمام امیدیں اور امنگیں ہمارے ملک کی عام ترقی سے وابستہ ہیں اور عام ترقی سے میری مراد وہ ترقی ہے جو فرزندان وطن کی یکساں حفاظت کرے بغیر اسکے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ انگلستان کو مبارکباد دی جا سکتی ہے کہ اس نے جو کام شروع کیا تھا، اس میں اسکو کامیابی ہوئی ہے۔ وہ وقت نہایت قابل فخر تھا جبکہ ماہ جون گذشتہ میں انڈین سول سروس ڈنر کے موقع پر لارڈ مارلے نے ہندوستان کی بیداری کا اشارہ کیا تھا۔ لارڈ موصوف نے اپنے مہمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ "اس بات سے انکار کرنا فضول ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں، جنکی ذمہ داری آپکی گردن پر ہے، ایک زندہ تحریک پائی جاتی ہے جو کچھ دنوں پہلے سے شروع ہوئی ہے اور آئندہ ترقی کرے گی۔ یہ ایک زندہ تحریک ہے اور یہ تحریک ان خواہشوں کا نتیجہ ہے جو ہمیں نے ان کو سکھائی ہیں۔"

سکھاتی ہیں۔

ہم کو شکر گزاری کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کو ایک عام پلیٹ فارم عطا کیا ہے جس پر کھڑے ہو کر وہ باہم مل سکتے ہیں اور ایک فیاضانہ ہمدردی ملک کا اعلان کر سکتے ہیں۔ یہ اعلان ان تمام قوموں اور مذہبوں کے فوائد اور حقوق میں دوستانہ تعلق قایم کرے گا جو اس ملک میں موجود ہیں۔ نسل اور مذہب کے لحاظ سے ہندوستان میں دو قومیں صاف طور سے سب قوموں سے آگے بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہندو قوم ہے جو برٹش انڈیا کی آبادی کے پانچ حصوں میں سے چار حصوں پر حاوی ہے اور ایک مسلمان قوم ہے جو آبادی کے پانچویں حصے کو پورا کرتی ہے۔ بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت بمقابلہ ہندوؤں کے بہ لحاظ ان کی تعداد کے جو چھ کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ ہے بہت بڑی نہیں ہے۔ لیکن اگر ملک کا وہ غیر مہذب حصہ نکال دیا جائے جو ہندوؤں میں شامل ہے تو مسلمانوں کی نسبتی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم اعداد سے قطع نظر کریں تو مسلمانوں کی قوم پولیٹیکل وجوہ سے بہت اہم ہے۔ جیسا کہ شملہ ڈیپوٹیشن کی عرضداشت میں ظاہر کیا گیا تھا۔ اس عرضداشت میں مسلمانوں کے حقوق کا اظہار کرتے ہوئے ان کی اس حیثیت پر ان الفاظ میں توجہ مبذول کرائی گئی تھی: "قیمت اس چندہ کی جو انہوں نے ہندوستان کے بچانے میں دیا ہے اور وہ درجہ جو سو برس پہلے ان کو اس ملک میں حاصل تھا اور جس کی روایتیں قدرتی طور سے ان کے دلوں سے فراموش نہیں ہو سکتیں۔" حضور وائسرائے نے اپنے جواب میں ان الفاظ کی سچائی کا اعتراف کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ "تم جایز طور سے یہ بات چاہتے ہو کہ تمہاری حیثیت اور درجہ کی قدر کی جائے، نہ صرف تمہاری تعدادی قوت کے لحاظ سے، بلکہ تمہاری پولیٹیکل اہمیت اور ان خدمات کے لحاظ سے جو سلطنت کیلئے تم نے انجام دی ہیں۔"

مگر صاحبو! یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پولیٹیکل اہمیت کی تصدیق حضور وائسرای کے بیان سے کی جائے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے بھی وقتاً فوقتاً اس بات کے کہنے سے ہماری اس حیثیت کا اعتراف کیا ہے کہ نیشنل کانگریس بحیثیت پولیٹیکل ایجنسی کے اس وقت تک نامکمل ہے جب تک کہ مسلمان آزادی کے ساتھ اس کی کاروائیوں میں شریک نہ ہوں۔ تیئیس برس سے کانگریس کے لیڈر کوشش کرتے رہے ہیں کہ مسلمان کانگرس کے سالانہ اجلاسوں میں شامل ہوں۔ ستمبر سے دسمبر تک مسلمانوں کی شرکت کی پولیٹیکل اہمیت کانگرس کے متعلق جلسوں

میں بیان کی جاتی ہے۔ ان کی وہ تقریریں، جن سے وہ مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، بلند ہو کر ہوا کو چیرتی ہیں اور ان کے اخبارات بھی عام طور پر مسلمانوں کی شرکت پر دلفریب مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کانگریس والوں کی اپیل کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ اسکی وجہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس موقع پر میں صرف یہ بات آپکے ذہن نشین کرنی چاہتا ہوں کہ آپ ایک بڑی قوم ہیں اور اس ملک کے پولیٹیکل معاملات میں آپ کو بے نظیر اہمیت حاصل ہے اور آپ کا فرض ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو سمجھیں، جو آپکے اہم درجے کے لحاظ سے آپ کی گردن پر ہے۔ ملک کی پولیٹیکل ترقیوں سے اب زیادہ مدت تک بے پروائی کرنا ممکن نہیں ہے۔ نیشنل کانگریس کی پولیٹیکل ترقی کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اب تک برابر چل رہی ہے جس کی رفتار معمولی نہیں ہے۔ محمڈن ایسوسی ایشن کی کوششوں سے گورنمنٹ نے ۱۸۸۵ء میں ایک رزولیوشن اس مضمون کا پاس کیا تھا کہ تعلیم میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یکایک ہماری قوم میں ایثار کی مثالیں موجود ہو گئیں۔ سر سید کی فطری قابلیت، ہمارے مہدی کی دلگداز فصاحت ہمارے مشتاق کی نہ تھکنے والی عملی طاقت، ہمارے حالی کی جوش دلانے والی شاعری، نذیر احمد کی پرخیال تحریرات اور شبلی کے مدلل مضامین نے اپنا کام کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو مہمیز لگائی کہ وہ مغربی تعلیم کے میدان میں دوڑیں۔ ان کی کوششوں نے کامیابی کا تاج پہنا۔ اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل ایسی نہیں ہو گی، جو پالیٹکس سے دور بھاگے۔ یہ نتیجہ اب تک ظہور میں نہیں آیا، مگر وہ ضرور نمایاں ہونے والا ہے۔ میں یہ نتیجہ لارڈ مارلے کے الفاظ سے نکالتا ہوں جو حسب ذیل ہیں "وہ آزادی اور قومیت اور سیلف گورنمنٹ کے خیالات سے سرشار"۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس نسل نے مل اور برک کے خیالات کی تند عقلی شراب پی ہے۔ اسی وجہ سے شملہ ڈیپوٹیشن کی عرضداشت میں یہ فقرے درج تھے کہ "موجودہ حالات نے جذبات کو بھڑکا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ نوجوان مسلمان اعتدال کے قبضے سے اور ~~سنجیدہ~~ سنجیدہ نگرانی سے باہر نکل جائیں"۔

صاحبو! اس وقت مسلمانوں کی قوم کو اس ملک کے اہم پولیٹیکل مسائل سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک سوال جو کچھ عرصہ ہوا، قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، یہ تھا کہ آیا گورنمنٹ اور دیگر ملکی باشندے کے مقابلہ میں ہم کو اپنی ایک علیحدہ پولیٹیکل مجلس بنا لینی چاہئے۔ اس سوال کے جواب میں "آل انڈیا مسلم لیگ قائم کر دی گئی۔ کچھ عرصہ ہوا نواب وقار الملک بہادر

لکھنؤ میں ایک جلسہ سربرآوردہ مسلمانوں کا میرے دوست سید حامد علی خان کے مکان پر منعقد کیا تھا۔ اس جلسہ میں میں بھی موجود تھا۔ جو لوگ اس جلسہ میں شریک تھے انہوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا کہ مسلمانوں کے حقوق اور فواید کی حفاظت کیلئے ایک علیحدہ اسلامی مجلس ضرور قایم کی جائے۔ دو برس ہوئے کہ یہ ضرورت اور بھی گہرے طور پر محسوس ہونے لگی اور اسکا نتیجہ وہ ڈیپوٹیشن تھا جو شملہ پر حضور وایسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی موقع اور اسی مقام پر ان (۳۵) سربرآوردہ مسلمانوں کی مجلس قایم ہوگئی، جن کے دستخط ڈیپوٹیشن کی عرضداشت پر تھے۔ پھر کچھ مہینوں کے بعد ڈھاکہ میں اس فیاض مسلمان لیڈر کی مہمان نوازی میں، جس سے میری مراد نواب بہادر ڈھاکہ ہیں، لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ پچھلے سال کراچی میں اس کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں ملک التجار سر آدم جی پیر بھائی کی افتتاحی تقریر سنی گئی۔ اسی اجلاس میں لیگ کے قوانین بنائے گئے اور یہ قوانین پچھلے مارچ میں علی گڑھ کے جلسے نے پاس کئے۔ جب لیگ کی کرسی صدارت کو ہز ہائنس سر آغا خان نے عزت بخشی تو یہ امر ہندوستانی مسلمانوں میں عام طور سے پسند کیا گیا اور کامل امید ہوگئی کہ اب لیگ کے وجود کو پورا قیام اور استحکام ہوگا۔ آج اس جلسہ میں ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمان نمائندوں کی موجودگی اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ مسلمانوں نے اب اپنی پولیٹیکل ذمہ داری سمجھ لی ہے اور یہ بات ~~[illegible]~~ بھی وہ سمجھ گئے ہیں کہ اپنی ہی قوم کے نوجوانوں کی نہیں بلکہ دیگر اقوام کے نوجوانوں کی حفاظت کرنا ان کا ایک فرض ہے۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اصلی فواید کو ترقی ہو۔ ہم کو یقین ہے کہ اس ملک کے اصلی فواید تبھی قایم ہو سکتے ہیں، جبکہ یہاں کی مختلف قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات ہوں۔ یہی وہ سیاسی منتہائے خیال ہے، جو قومی کیریکٹر کو تمام قوموں کے فواید کی حفاظت اور ترقی کی طرف مایل کرتا ہے۔

صاحبو! میں لیگ کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ان تمام اقوام کی پولیٹیکل اصلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں، جو ہمارے اس محبوب ملک کی سرزمین پر آباد ہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا مشن نہ خود غرضی ہے، نہ فریقانہ دست اندازی۔ میں اس بات کی بھی تردید کرتا ہوں کہ لیگ اس ملک کی دیگر پولیٹیکل مجلسوں کی مخالف ہے۔ یا وہ بالکل گورنمنٹ کے ماتحت ہے۔ ہم کو صفائی، بےخوفی اور بہادری سے گورنمنٹ کی باتوں پر نکتہ چینی کرنیکا حق حاصل ہے۔ ہم کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ ہم ادب کے ساتھ گورنمنٹ کے بعض قاعدوں کے جاری کرنے کے خلاف اعتراض کریں۔

اور ان کی مخالفت کریں۔ ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم گورنمنٹ کی کسی پالیسی کی عمدگی سے انکار کریں بشرطیکہ وہ عمدہ نہ ہو۔ ہم کو حق ہے کہ جب ہمارا ملک کوئی اصلی اور حقیقی صدمہ برداشت کر رہا ہو تو ہم اپنے برادران وطن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا دیں، مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے ساتھ ہمارے جو تعلقات ہیں، ان کی نسبت ہم کبھی یہ اجازت نہیں دیں گے کہ دشمنی کا جذبہ ہمارے رستے میں حائل ہو اور وہ ہماری قوت فیصلہ میں کمزوری اور ہماری قوم میں بدخیالی اور غداری پیدا کرے۔

صاحبو! ان بےچینی کے ایام میں وفاداری کا اعلان مثل اس شخص کے ہے جو کسی پھسلتی زمین پر کھڑا ہو، لیکن انگریزوں کے وفاداری کے خیال کو چھوڑ کر اگر غور کیا جائے تو ہندوستانی عقل اس بات کو سمجھ سکتی ہے کہ ہندوستان کی ترقی اس ملک کے اندرونی امن وامان پر منحصر ہے اور موجودہ حالت کے لحاظ سے اندرونی امن وامان انگریزوں ہی کے قبضے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ انگریزی قبضہ ایسا نہ ہو جیسا کہ کنیڈا میں ہے، یا آسٹریلیا میں یا جنوبی افریقہ میں، بلکہ ایسا قبضہ ہو جیسا کہ پچھلے پچاس سال میں رہا ہے، جس میں ہم نے امن وامان کے لطف اٹھائے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ جب تک ہم میں فرقہ وارانہ جذبات اور مذہبی تعصبات کو مغلوب کرنے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے، اور جب تک ہم ان خوفناک حالات کو نہ بدل ڈالیں جو آپس کی مخالفتوں کے سبب نمایاں ہوتے ہیں، تب تک انگریزی قبضہ ملک کی ترقی میں خاص عنصر ہے۔

ہندوستان کو اس بات کے پہچاننے کی ضرورت ہے کہ ملک کی اصلی ہمدردی یہ ہے کہ ایسی تجویزیں اختیار کی جائیں جو اس وقت ممکن العمل ہیں، نیز ملک کی اصلاح میں اپنے تئیں [redacted] ہمہ تن غرق کر دیا جائے۔ خیالی باتیں ضرور خوشگوار ہوتی ہیں، مگر عملی پالیٹکس میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ خیالی سوراج جیسا کہ ہائی کورٹ کلکتہ کے فیصلہ میں سمجھا گیا ہے ایک خوشنما تصویر ہے، مگر جن ججوں نے یہ فیصلہ لکھا ہے ان کا کام اس امر پر بحث کرنا نہ تھا کہ یہ سوراج پولیٹیکل لحاظ سے ممکن ہے یا نہیں، بلکہ ان کا کام صرف اس بات کا معلوم کرنا تھا کہ آیا یہ خیال کوئی ایسی بات بھی سکھاتا ہے جو خلاف قانون ہے۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا سوراج طلب کرنا جیسا کہ ججوں نے سمجھا ہے، خلاف قانون یا موجب دغابازی ہے۔ مگر میں نہایت قوی اور معقول دلائل کی بنا پر کہتا ہوں کہ سب سے بڑی پولیٹیکل غلطی ہوگی ہندوستانیوں کی اگر وہ سوراج طلب کریں اور برٹش پارلیمنٹ کی، اگر وہ سوراج ہندوستانیوں کو عطا کرے حال میں یا

آیندہ بہت عرصہ تک۔ میں اس بات کا قایل ہوں کہ اگر سواراج جاننے والوں کی سلف گورنمنٹ سے وہ چیز مراد ہے جس کو ہمارے ملک کے ایک نامور شخص ڈاکٹر راش بہاری گھوش نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "ہندوستان میں خود ملکی حکومت؛ مگر کامل آزادی کے ساتھ نہیں" تو اس میں وفاداری کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، مگر صاحبو! ہندوستان کے تمام باشندے قانون دان نہیں ہیں اور نہ وہ قانونی نکات سے واقف ہیں۔ اگر عام آدمی بغیر سمجھے ان قانونی نکات کے جن پر ججوں کا فیصلہ مبنی ہے، سواراج کے متعلق خیالات دوڑانے شروع کریں، تو اس سے کسقدر خطرناک نتایج پیدا ہوں گے۔ سواراج یا سلف گورنمنٹ تب ہی ممکن ہے جبکہ نسلی، مذہبی، تمدنی اور عقلی اختلافات دور کردیئے جائیں اور مختلف گروہوں کی خصوصیات گھل مل کر اسطرح ہموار ہو جائیں کہ انکی نمایاں چیز صرف قومی زندگی ہو۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبہ "بندے ماترم" کی فریقی آواز بلند کرتا ہے اور سیواجی کی برسی بطور ایک فریقی تہوار کے مناتا ہے، تو میرا دل مایوسی سے بھر جاتا ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ یہ خاص ہندوؤں کی قومیت کا وعظ ہے، جو عام قومیت کے لباس میں کیا جاتا ہے۔ کیا اکبر اور اورنگ زیب کے تجربوں کی ناکامی کے بعد اب یہ تیسرا تجربہ ہے، جو ناکام ہو رہا ہے؟ کیا پچاس سال کی انگریزی تعلیم کی اشاعت نے ملک میں پھر وہی تفریقی خیالات پیدا کردے ہیں۔

صاحبو! میں اصل مطلب کی طرف پھر رجوع کرتا ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مختلف گروہوں کی جدا جدا کانفرنس اور ایسوسی ایشنوں کا قایم ہونا ضروری ہے، تاکہ ہر گروہ کے خیالات اور جذبات کا صحیح اظہار ہو اور جو لوگ قومی زندگی کی عمارت تیار کرنی چاہتے ہیں انکے سامنے تمام فرقوں اور گروہوں کی ضروریات اور جذبات کا نقشہ ہو اور قومی زندگی کا اصلی گر ان کے ہاتھ آئے۔ ایسا کرنا اس ملک بہت زیادہ ضروری ہے، جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں جیسے دو بڑے گروہوں کے جذبات باہم ٹکراتے ہوں، کیونکہ اگر وہ ایک دوسرے سے ناواقف ہوں، تو قومی ترقی کے پہیوں کو پیچھے کھینچ سکتے ہیں۔ میں ہندوستان کی قومیت کے معماروں سے، خواہ وہ کلکتہ میں ہوں یا پونا میں، پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے مسلمان "بندے ماترم" اور "سیواجی کی برسی" کو بطور قومی شعار اور قومی تہوار کے قبول کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مسلمان اور لحاظ سے کمزور ہوں، مگر وہ اپنے شاندار زمانہ ماضی اور اپنی شاندار تاریخی روایات کے برقرار رکھنے میں کسی طرح کمزور

نہیں ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کانگریس کے لیڈر ملک کے سامنے پولیٹکل ترقی کا ایسا پروگرام
پیش کریں، جس میں کسی گروہ کے جذبات کی قربانی نہ ہو، خواہ وہ گروہ ہندوؤں کا ہو
یا مسلمانوں کا، عیسائیوں کا ہو یا پارسیوں کا۔ سلف گورنمنٹ کیلئے تیاری اس طرح نہیں ہو سکتی
کہ ہر سال اس پر ایسے پرجوش لفظوں میں زور دیا جائے، جس سے اس ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کے
جذبات بھڑک جائیں اور ان کو لا حکومت کی طرف کھینچ لے جائیں، جیسا کہ آج کل بنگال میں
دیکھا جاتا ہے اور نہ سلف گورنمنٹ کیلئے تیاری اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم ہندوستانی پالیٹکس کی
طوفانی لہروں میں سوراج کی کمزور کشتی کو بغیر اس بات کا اندازہ کرنے کے بے تکلف دھکیل
دیں کہ آیا وہ کشتی سمندر میں ڈالنے کے قابل ہے یا نہیں۔ کیا سوراج کا یہ مطلب ہے کہ ملک کے تمام
اندرونی معاملات، یعنی قانون سازی، مالیہ، دیوانی، فوجداری، پولیس، تعلیم اور جنگی اور
فوجی انتظامات کی باگ انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دی جائے؟
میں سمجھتا ہوں کہ بیشک یہی مطلب ہے اور الہ آباد کنونشن کمیٹی کی پہلی دفعہ سے یہی معنی مراد ہیں۔ اس
دفعہ میں کانگریس کا مقصد ان لفظوں میں بتایا گیا ہے: "ہندوستانیوں کا ایسی طرز حکومت حاصل
کرنا، جیسی کہ سلطنت برطانیہ کی نو آبادیوں کے باشندوں کو حاصل ہے" وہ خیال جو حالات اور
واقعات سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو، بلاشبہ ایک فضول اور بے معنی خیال ہے۔ یہ بات سمجھ میں
نہیں آتی کہ اعتدال پسند اور انتہا پسند گروہ کیوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ کیا یہ بات عقلمندی
کی ہے کہ ہم اپنے پولیٹکل اتحاد کی طاقت کو کمزور کر دیں۔ کیا ہم ہندوستانیوں نے اپنے گھر کا
اندرونی انتظام درست کر لیا ہے۔ کیا ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلافات دور کر دئے ہیں۔
وہ کونسی چیز ہے جس نے مسلمانوں کو کانگریس سے جدا کر رکھا ہے۔ میں اس آخری سوال کے جواب میں
کہتا ہوں کہ کانگریس کی اس خواہش نے کہ قانون سازی اور ملکی انتظام انگریزوں کے ہاتھ سے نکلکر
ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائے۔ اس خواہش کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ملک کی حکومت
اس گروہ کے ہاتھ میں آجائے جس کی کثرت رائے ہندوستانی سلف گورنمنٹ کی کونسلوں میں ہو۔
صاف ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑیگا۔ سرسید نے اس سوال کا جواب،
اکیس برس گزرے، اپنی لکھنؤ والی اسپیچ میں دیا تھا، جس پر آج تک ہندوستان کے مسلمان کا عمل درآمد
رہا ہے اور وہ کانگریس سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ "آل انڈیا مسلم لیگ" کو پھر اسی جواب کا اعادہ
کرنا ہے۔ کیا مسلمان اس کانگریس کی رایوں کو قبول کر لیں، جو سورت کے بدقسمت اجلاس سے پہلے تھی۔

بلا شبہ بہت سی پولیٹیکل اغراض ہیں جن میں دونوں قوموں کا فایدہ مشترک ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ لیگ ان اغراض میں اپنے برادران وطن کے ساتھ اتفاق نہ کرے اور محبت اور ہمدردی سے پیش نہ آئے۔ وہ اغراض حسب ذیل ہیں: عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علحدگی؛ ان قوانین کے منسوخ کرانے کی خواہش، جو ہندوستانیوں کیلئے باعث ذلت ہیں؛ ابتدائی تعلیم کی ترقی؛ حفظان صحت کی تجاویز؛ ہندوستان کے تمام گروہوں کے باشندوں کا سرکاری ملازمت کے اعلی محکموں میں بہت زیادہ تعداد میں داخل کیا جانا؛ مقامی سلف گورنمنٹ کے معاملات میں سرکاری مداخلت کا جاری نہ رہنا؛ فوجی اخراجات میں بغیر اس بات کے کہ فوج کی عمدگی خطرہ میں ڈالی جائے، معقول تخفیف ہونا؛ ہندوستان کی جنگی قوموں کو والنٹیر بننے کی اجازت ملنا؛ ہندوستانیوں کو فوج میں کمیشن دیا جانا؛ ھوم چارجز کا باقاعدہ موازنہ کیا جانا؛ دیہاتی پنچایتوں کو چھوٹے چھوٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصل کرنے کا اختیار عطا ہونا؛ ملکی صنعت و حرفت کی حفاظت کرنا اور اسکو ترقی دینا؛ حاکموں اور محکوموں کے درمیان اخلاقی تعلقات کا اصلاح پرلانا۔ یہ ہیں وہ اغراض عام، جن کا تعلق ہندوستان کے تمام گروہوں سے ہے۔ میں اس الزام سے انکار کرتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمان ان اصلاحات پر عمل کرنے میں اتفاق کی قدروقیمت نہیں جانتے اور انمیں سرکاری ناپسندیدگی کا مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہے۔

صاحبو! مسلمانوں کی پولیٹیکل دوراندیشی اور ان کی جرات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ وہ ان دونوں باتوں میں کسی طرح کم نہیں ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ مسلمان کانگریس سے علحدہ کیوں ہیں۔ مسلمانوں کی علحدگی اسوجہ سے نہیں ہے کہ وہ اتفاق کرنا نہیں چاہتے اور نہ اسوجہ سے ہے کہ وہ خواہ مخواہ حاکموں سے ڈرتے اور دبکتے ہیں۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ کانگریس بھی اصلاحات نہیں چاہتی؛ بلکہ وہ ان سے بہت زیادہ اور بہت بڑی تبدیلیاں چاہتی ہے۔ حکام سے فریقی اصلاحیں طلب کرنا گویا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ انگریزوں کی حکومت کی ضرورت اس ملک میں ابھی اور ہے۔ ان سے اس بات کا مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی حکومت ہم کو دیدیں، درحقیقت سنجیدگی سے یہ کہنا ہے کہ وہ جہاز میں سوار ہوکر روانہ ہوجائیں اور بلاشبہ یہ حکومت کی تبدیلی کا مطالبہ ہے۔ الہ آباد کنونشن کی پہلی دفعہ میں موجودہ طرز حکومت کی اصلاح کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی موجودہ طرز حکومت ویسی نہیں ہے جیسی انگریزی نوآبادیوں میں ہے۔ موجودہ طرز حکومت کی اصلاح طلب کرنا واقع میں ایک اور

مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے جو اس دفعہ میں مخفی ہے اور وہ انگریزی نوآبادیوں جیسی طرز حکومت ہے جس کا حاصل کرنا کانگریس کو مدنظر ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طرز حکومت کی اصلاح سے فی الحقیقت اس کی اصلاح مقصود نہیں ہے؛ بلکہ یہ امر مطلوب ہے کہ موجودہ طرز حکومت بالکل اڑا دی جائے۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ حق ہے کہ اس دفعہ کا مطلب صاف صاف طور پر ان کو سمجھایا جائے۔ یہ خواہش نا قابل تعریف ہے؛ مگر طریق عمل موزوں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اختلاف ایک عرصہ تک پوشیدہ رکھا جائے؛ جو اس اصول کے متعلق کانگریس والوں کے درمیان ہے؛ مگر یہ امید کرنا سراسر غلطی ہے کہ وہ ہمیشہ چھپا رہیگا۔ اعتدال پسند چاہتے ہیں کہ وہ ایک خود ملکی حکومت تاج برطانیہ کی حفاظت میں حاصل کریں؛ مگر انتہا پسند ایسی خود ملکی حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو تاج برطانیہ کی حفاظت میں نہ ہو۔ حقیقت میں یہ دونوں گروہ موجودہ طرز حکومت کی اصلاح کی طلب گار نہیں ہیں؛ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ بالکل ملیا میٹ ہو جائے۔ کنیڈا اور آسٹریلیا انگلستان سے بذریعہ نسلی اور مذہبی جذبات کے وابستہ ہیں۔ ٹرانسوال کے بوئیروں کو سلف گورنمنٹ حال ہی میں عطا ہوتی ہے۔ اس کی نسبت ابھی اس امر کی پیشین گوئی نہیں ہو سکتی کہ وہاں برطانیہ کی اعلیٰ حفاظت کی عزت کہاں تک کی جائے گی۔ امریکہ میں اس حفاظت کا تعلق کمزور تھا، اس لئے ''بوسٹن پورٹ بل'' سے اس کا ٹوٹ جانا ممکن ہو گیا۔ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان بہت سے مذہبی تمدنی اور اخلاقی اختلافات حائل ہیں؛ اس لئے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے خیالات کا اس ملک کی تبدیل حالت کے لئے ظہور میں آنا ناممکن العمل ہے۔ اگرچہ انتہا پسندوں کا خیال غداری میں ڈوبا ہوا ہے، تاہم اس میں کوئی مکر و فریب پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ایمانداری سے ملک کے سامنے اپنی یہ رای پیش کرتے ہیں کہ اگر سلف گورنمنٹ ہندوستان کو حاصل ہو جائے تو انگریز ہندوستان سے تعلق نہ رکھ سکیں گے مگر اعتدال پسند سلف گورنمنٹ کے حاصل ہونے کی امید رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ برٹش گورنمنٹ کی اعلیٰ حفاظت کی عزت کریں گے اور انگریزوں کے ساتھ پورے وفادار رہیں گے؛ مگر حضرات! کیا یہی وہ بات ہے جس کی ہندوستان کو ضرورت ہے۔ کیا ہندوستان کیلئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسی خام خیالیاں پیدا کی جائیں۔ کیا ملک کے دماغ سے عقل کی روشنی کافور ہو گئی ہے۔ کیا سلف گورنمنٹ کی عمارت اوپر سے بنے گی؛ نیچے سے نہیں۔ میں آپ سے اپنی ایک تقریر سے چند فقرے اقتباس

کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، جو میں نے بہار پراونشل کانفرنس کے پہلے جلسہ میں کی تھی جبکہ میں اس کا صدر نشین قرار دیا گیا تھا۔ وہ فقرے یہ ہیں کہ "میرے نزدیک یہ مسئلہ کہ ہم سلف گورنمنٹ کے فواید حاصل کرنے کیلئے اپنے تئیں کیوں کر تیار کریں، بہ نسبت اس بات کے بہت زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس حق کے حاصل کرنے میں ضد کریں، جس کے عطا کرنے سے گورنمنٹ اس صورت میں کبھی انکار نہیں کر سکتی، جبکہ ہم اس کی قابلیت اپنے اندر پیدا کر لیں اور اسکی تمام ضروری شرائط کو پورا کر دیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان میں قومی زندگی کی ترقی کیلئے جو خطرہ درپیش ہے وہ اندرونی ہے نہ کہ بیرونی۔ ہندوستان کے خیالی سلف گورنمنٹ کے پیغمبروں نے اب تک نہیں بتایا ہے کہ جو سلف گورنمنٹ وہ حاصل کرنی چاہتے ہیں، وہ اندرونی امن و امان کو کس طرح قایم رکھیگی۔ اس گورنمنٹ کا ہندوستان کے فرمانرواؤں سے کیا تعلق ہوگا۔ وہ جنگی اور فوجی انتظام کیونکر کریگی۔ وہ ان اختلافات کو، جو تعلیم کے باب میں ہوں گے کس طرح دور کرے گی۔ وہ بیرونی ملکوں کے ساتھ اپنے تعلقات کس طریقہ سے قایم کرے گی۔ وہ غیر ملکوں کے تاجروں کو ان کی حفاظت کا کیونکر یقین دلائے گی جن کے کروروں روپے ملک میں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ ہندوستان کے انگریزوں کی حفاظت کس طرح کرے گی۔ وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کی مذہبی، تمدنی اور نسلی مخالفتوں کو کیونکر دور کرے گی۔ اے سلف گورنمنٹ کے پیغمبرو! کیا آپ پالیٹکس کو مذہبی جذبات اور نسلی تعصبات سے جدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی گروہ کسی خاص جانور کی قربانی کرے یا اور کوئی ایسی بات کرے جس سے دوسرے گروہوں کی مذہبی عصبیت بھڑک اٹھے تو کیا ان حالات میں یہ بات حماقت آمیز نہ ہوگی کہ ہم ہندوستان کی پالٹیکس کو ان باتوں سے جدا سمجھیں۔ بلاشبہ سلف گورنمنٹ کے حاصل کرنے سے پہلے ہمارا منتہائے خیال "متحد ہندوستان" ہونا چاہیے۔ سورت کے اجلاس کانگریس کے پریزیڈنٹ نے کسقدر صحیح کہا تھا کہ "وہ باتیں جو دوسری قوموں کی تاریخ سے اور دوسرے زمانوں سے جلد بازی کے ساتھ سیکھی جائیں، نہایت خطرناک ہوتی ہیں، کیونکہ حالات ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے اور جو کام ایک وقت میں کوئی خاص نتیجہ پیدا کرتا ہے، ممکن ہے کہ وہ دوسرے وقت میں اور دوسرے ملک میں اور دوسرے حال میں بالکل اسکے برعکس نتیجہ پیدا کرے"۔ کیا ان خام خیالیوں نے ملک میں انتہا پسندی اور لاحکومیت پیدا نہیں کر دی اور کیا ان کی وجہ سے بمبازوں کے گروہ اور خفیہ سازش کی کمیٹیاں جا بجا کھڑی نہیں ہو گئیں۔

صاحبو! کیا ایک ناممکن العمل خواہش کا خیال ان تجویزوں کا معاوضہ ہوسکتا ہے، جو دو برس کے اندر گورنمنٹ کی طرف سے پاس کی گئی ہیں۔ سنہ ۱۸۱۸ء کے قانون بغاوت کا از سر نو اجرا، مئی سنہ ۱۹۰۷ء کا قانون، بغاوت انگیز جلسوں کا قانون، اخبارات کا قانون، جدید قانون فوجداری: یہ سب کڑوے پھل ہیں ان خام خیال لوگوں کی محنتوں کے۔ ان قوانین پر ہم کو خود اپنے تئیں الزام دینا چاہئے۔ بلاشبہ اس کی ذمہداری ان لوگوں کی گردن پر ہے جنہوں نے خام خیالی پیدا کرکے ہندوستانی تعلیم یافتوں میں یہ بیچینی پیدا کردی ہے۔ نیابی حکومت کے وعظ نے ہندوستان میں ایسی خواہشیں پیدا کردی ہیں، جن کا پورا ہونا کسی خاص زمانہ تک ناممکن ہے۔ مگر اس کا صریح نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بددلی پیدا ہوگئی ہے۔ کیا یہ باتیں مسلمانوں کیلئے سبق آموز نہیں ہیں۔ کیا لیگ کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ کانگریس کے علم برداروں کو یہ صلاح دے کہ وہ ملک میں ان تکلیفوں کو جاری نہ رہنے دیں اور ہندوستان کے امن و امان کو خطرہ میں نہ ڈالیں۔ فی الحال کانگریس کو سلف گورنمنٹ کے خیالات سے اپنے تئیں دور رکھنا چاہئے اور اس کو اعلان کرنا چاہئے کہ ہماری عملی پالیٹکس میں انگریزوں سے وفاداری کرنا بمنزلہ ہندوستان سے وفاداری کرنے کے ہے اور موجودہ طرز حکومت کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے کہ انگریزی سلطنت اس ملک میں قایم رہے۔

صاحبو! اس تمام بیان سے میری غرض یہ ہے کہ کانگریس میں اور اس عظیم الشان قوم میں جس کے نمایندے آپ لوگ ہیں، اتحاد و اتفاق ہو جائے، اور ہندوستان کی بیداری اور ترقی میں ہمارے حاکموں کا مضبوط اور رہنما ہاتھ ہمارے سر پر ہو۔ جب تک کانگریس کے لیڈر کوئی ایسی عملی پالیسی نہ بتائیں، جیسی کہ میں نے بیان کی ہے، ہماری لیگ کا یہ مقدس فرض ہوگا کہ وہ نوجوان مسلمانوں کو غلطی سے اس پولیٹکل منصوبے میں شریک ہونے سے باز رکھے، جس کی نسبت لارڈ مارلے کا قول ہے کہ وہ مثل ایک بچے کے ہے جو چاند کو پکڑنے کیلئے روتا ہو۔ الہ آباد کنونشن کی دفعہ (۲۶) میں یہ بات درج ہے کہ کانگریس میں کوئی مضمون داخل نہیں کیا جائیگا، جس پر کہ ہندو یا مسلمان مندوبوں کی تین چوتھائی تعداد اعتراض کرے۔ میں نے اخبارات میں اس کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے اور وہ مضمون بھی "ہندوستان ریویو" میں پڑھا ہے، جو مسٹر عباس طیب جی کے قلم سے نکلا ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دفعہ سے کم تعداد قوموں کی حفاظت مطلوب ہے۔ میں

اس دفعہ کے بنانے والوں اور اس کے پسند کرنے والوں کی عزت کرتا ہوں؛ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کم تعداد قوموں کے حقوق کی یہ حفاظت کسی طرح اہم نہیں ہو سکتی، جب تک کہ مندوبوں کی تعداد کانگریس میں مقرر نہ ہو جائے اور کم تعداد گروہ اپنے فریقی انتخابی حلقے قایم نہ کرلیں؛ کیونکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب کانگریس میں مندوبوں کی ایک غیر معین تعداد شامل ہو تو ہماری قوم کی چند سیدھی سادی روحیں، جو کانگریس میں کبھی شریک ہوں، اپنے تئیں اپنے ہم مذہبوں کی کمی تعداد اور غیر مسلمان منتخب کنندوں کی وجہ سے مغلوب پائیں گی۔ کم تعداد جماعتوں کی حفاظت کیلئے، ضروری ہے کہ ان کی حفاظت کے اصول مستحکم ہوں اور وہ فریقی انتخاب کے طریقہ سے اپنے مندوبوں کو منتخب کر سکیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کونسلوں کی اصلاح کی اسکیم میں یہ اصول مدنظر رکھا گیا تھا اور اس بنا پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ انتخابی حلقہ ضروری سمجھا گیا تھا۔

صاحبو! اگر کانگریس ان دو باتوں میں کوشش کرے، یعنی ایک تو وہ خام خیالیوں کو ترک کردے، دوسرے کم تعداد گروہوں کی حفاظت کا مضبوط اصول مقرر کردے، تو ہر طرح سے امید کی جاتی ہے کہ ہماری لیگ کا منتہائے خیال "متحد ہندوستان" بہت جلد پورا ہوگا۔

صاحبو! میں اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بہار میں ہم نے اس رخ پر چلنے کی ابتدا کردی ہے اور بہار پراونشل کانفرنس، جو گذشتہ اپریل میں بمقام پٹنہ منعقد ہوئی تھی اس میں ہندو و مسلمان دونوں شریک ہوئے تھے۔ ہماری کانفرنس نے ایسے عملی طریقہ کی بنیاد پر کام کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ اس میں باہمی اختلاف نہ ہو۔

صاحبو! اگر میری کمزور آواز سر فیروز شاہ مہتا، مسٹر گوکھلے اور ڈاکٹر راش بہاری گھوش وغیرہ کانگریس کے لیڈروں تک پہنچ سکے تو میں ان سے التجا کرتا ہوں کہ وہ یقین کریں کہ یہ دردمندانہ آواز سچے دل سے نکلی ہے اور مسلم لیگ کا عقیدہ یہ ہے کہ حاکموں کے ساتھ موافقت ہو اور غیر مسلمان اہل وطن کے ساتھ اتحاد ہو اور خود مسلمانوں کی قوم مضبوط اور مستحکم بنیاد پر کھڑی ہو، یہی وہ منتہائے خیال ہے جس کو ہم "متحد ہندوستان" کے لفظ تعبیر کرتے ہیں۔

صاحبو! میں ڈرتا ہوں کہ میں نے آپکے صبر و تحمل پر بہت دیر تک دست اندازی کی ہے؛ مگر میں اس افتتاحی تقریر کو تمام مسلمانان ہند سے یہ اپیل کئے بغیر ختم نہیں کر سکتا کہ سب سے بڑا فرض جو ان کے بادشاہ کا اور ان کے ملک کا اور خود ان کا ان کے ذمے ہے، یہ ہے کہ وہ اپنی قومیت کے

وجود کو مضبوطی اور استحکام کے ساتھ قایم رکھیں - ہم کو یہ بات فراموش نہیں کرلی جاہیے کہ ہمارا آپس میں اختلاف کرنا اپنا گلا آپ کاٹ لینا اور اپنے پولٹیکل درجے کو پامال کرنا ہے -

صاحبو! اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپکی آواز اس ملک میں سنی جائے تو آپ کو اول اپنے درمیان اتحاد و اتفاق کا مضبوط رشتہ قایم کرنا چاہیے - آپ کی خدمات کی ضرورت گورنمنٹ کو بھی ہے اور اس ملک کے غیر مذہب باشندوں کو بھی - آپ کا فرض ہے کہ آپ گورنمنٹ کو ان تجاویز کی تعمیل میں مدد دیں، جو بغاوت اور لاحکومیت کو دور کرنے کیلیے اختیار کی گئی ہیں - نیز یہ بھی فرض ہے کہ آپ غیر مسلمان باشندگان ملک کے ساتھ گورنمنٹ سے اس امر کے مطالبہ کرنے میں شریک ہوں کہ وہ اس ملک کی انتظامی اصلاح کا ایسا طریقہ تجویز کرے، جو اسکی شان کے شایاں ہو -

صاحبو! ہمارا ملک اسوقت دردزہ جیسی تکلیف میں مبتلا ہے اور اس کے اعصاب میں تشنج ہو رہا ہے - یہی وہ سب سے زیادہ ضروری وقت ہے، جس میں آپ کو ملکی فوائد کی خدمت کرنے میں باہم اتحاد اور اتفاق کرنا چاہیے اور ایک ایسے عمدہ طریقہ سے جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہمدردی اور الفت پیدا کرے، آپ کو اپنی اہمیت ثابت کرلی چاہیے - کیا آپ بغیر آپس کے اتحاد کے اس مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، جب تک کامل پولٹیکل طاقت حاصل نہ ہو، آپ کی قومیت کے گرد و پیش خطرات برابر منڈلاتے رہیں گے - اس بنا پر میں پھر التجا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو زندہ رہنا اور اپنے وجود کو قایم رکھنا منظور ہے، تو باہم متحد ہو جائیں -

صاحبو! لارڈ مارلے کا جو مراسلہ کونسلوں کی اصلاح کے متعلق حضور وایسرائے کے نام آیا ہے، وہ اس اصول سے چشم پوشی کرتا دکھائی دیتا ہے کہ کم تعداد قوموں کا انتخاب شروع سے اخیر تک فریقی بنیاد پر ہونا چاہیے - بغیر اس اصول کے مسلمان اس اصلی حفاظت کی امید نہیں کر سکتے جو ان کے حقوق اور فوائد کے لئے ضروری ہے - میں اس مراسلہ پر عجلت کے ساتھ کوئی رائے قایم نہیں کر سکتا؛ مگر یہ کہنا ضروری ہے کہ اصول زیر بحث ہماری قوم کیلئے نہایت اہم ہے اور ان خطرات سے جو اس مراسلہ کی نامکمل تجویزوں سے پیش آنے والے ہیں، تمام قوم کا متفقہ اظہار رائے ہی ہم کو بچا سکتا ہے؛ اس لئے اے صاحبو! میں پھر التجا کرتا ہوں کہ آپ متحد ہو جائیں - یہ ایک مقدس فرض ہے، جو آپکی اور آپ کی آیندہ نسلوں کی طرف سے آپ کی گردن پر ہے -

Close Crop
5,7,11,25,29,31,33,35,37,39,

Torn
5

damage
21